دیویندر اِسر: تنہائی اور یادوں سے مکالمہ

محمد راشد اقبال
پی ایچ۔ڈی سکالر (اُردو) پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور
محمد سہیل اقبال
پی ایچ۔ڈی سکالر (اُردو) بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

DEVENDAR ISSAR: DIALOGUE WITH SOLITUDE AND MEMORIES

Muhammad Rashid Iqbal
PhD Scholar (Urdu), Oriental College Lahore
Muhammad Sohail Iqbal
PhD Scholar (Urdu), IIU, Islamabad

Abstract

Subcontinent's prolific and versatile writer Devendar Issar was born in Attock city, Pakistan. In his life time, he had to relocate himself from one place to another. After the partition, he migrated to India. Soon after migration, he faced inexplicable grief of his mother's demise. These catastrohic events affected him psychologically. The effects of all these catastrophic events have been depicted in his fiction. Aloofness and nostalgia occupy a prominent place in his work. The formation of the novel' "Khushbu Ban Ke Lautenge" consists of different extracts and paragraphs that have been selected from his short stories and essays. This article explores the nostalgic feelings of the writer.

Keywords:

دیویندر اِسر، کیمبل پور (اٹک)، ہجرت، تنہائی، یادیں، ناول، افسانہ

دیویندر اِسر اُردو، ہندی کے معروف دانش ور، نقاد اور فکشن نگار ۱۴ اگست ۱۹۲۸ء کو کیمبل پور (اٹک) میں پیدا ہوئے۔ انٹر اور گریجویشن کے امتحانات گورنمنٹ کالج اٹک سے پاس کیے۔ تقسیم ہند کے بعد ہندوستان ہجرت کی۔ الہ آباد یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم اے، کیا مزید تعلیم کے حصول کے لیے امریکہ چلے گئے اور وہاں سے ابلاغیات کی ڈگری حاصل کی۔ اس تعلیم کے اثرات ان کے تنقیدی نظریات ور جحانات پر واضح طور پر مرتب ہوئے۔ ادبی زندگی کی ابتدا گورنمنٹ کالج اٹک کے میگزین ''مشعل'' میں ''منٹو ایک ادبی جراح''، ''کچھ ٹیگور کے بارے میں'' اور ''مداوا'' کتاب پر تبصرہ لکھ کر کی۔ (۱)

دیویندر اِسر اُردو، ہندی دونوں زبانوں میں مسلسل فکشن اور تنقید لکھتے رہے۔ ان کی کچھ کتب انگریزی زبان میں بھی موجود ہیں۔ اُردو میں لکھی جانے والی کتب میں چار افسانوی مجموعے ''گیت اور انگارے (۱۹۵۲) شیشوں کا مسیحا (۹۵۵) کینوس کا صحرا (۱۹۸۳) پرندے اب کیوں نہیں اڑتے (۹۹۲) اور ایک ناولٹ خوشبو بن کے لوٹیں گے (۱۹۸۸) میں شائع ہوا۔ اُردو میں لکھی جانے والی تنقیدی کتب میں ''فکر وادب'' (۱۹۵۸) ادب اور نفسیات (۱۹۶۳) ادب اور جدید ذہن (۱۹۶۸) مستقبل کے روبرو (۱۹۸۶) ادب کی آبرو (۱۹۹۶) نئی صدی اور ادب (۲۰۰۰) شامل ہیں۔

''خوشبو بن کے لوٹیں گے'' دیویندر اِسر نے پہلے ۱۹۸۶ میں ہندی اور ۱۹۸۸ میں اسے دوبارہ اُردو میں لکھا۔ ہندی میں لکھے جانے کے سبب اُردو کے ناقدین اسے نظر انداز کرتے رہے۔ نند کشور وکرم کی کتاب ''ایک دانشور ایک مفکر: دیویندر اِسر'' میں 'خوشبو بن کر لوٹیں گے' کے بارے میں چار مضامین شامل ہیں جن میں سے دو ہندی سے ترجمہ کیے گئے ہیں اور دو انتہائی مختصر اُردو میں ہیں ''چہار سُو'' دیویندر اِسر نمبر نکالا گیا اس میں بھی اس ناول کے حوالے سے کوئی مضمون نہیں ملتا ہے۔ اس میں صرف ناول کے پہلے باب کو شامل کرنے پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ''عالمی ادب'' کا گوشہ دیویندر اِسر میں اس ناول پر کوئی تنقیدی مضمون نہیں لکھا گیا جبکہ اس میں بھی ناول کا پہلا باب شامل ہے۔ انڈیا اور پاکستان میں اُردو ناول پر لکھی گئی تنقیدی کتب میں بھی اس ناول کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے۔ ناول جس زبان میں پیش کیا جاتا ہے وہ ناول اسی زبان کا کہلایا جاتا ہے۔ 'خوشبو بن کے لوٹیں گے' کو دیویندر اِسر نے پہلے ہندی زبان میں لکھا اور بعد میں اسی ناول کو اُردو میں لکھا۔ اس وجہ سے یہ ناول ہندی اور اُردو دونوں زبانوں کا ناول ہے اور ناول کا دونوں زبانوں کی تاریخ سے تعلق بنتا ہے لیکن اس ناول کو نظر انداز کیا گیا لہٰذا اس ناول کو صرف ہندی تک محدود کرنا نقادوں کی اس ناول کے ساتھ ناانصافی ہے۔

ناول کے پیش لفظ ''سوال یہ تھا'' میں بھی اس کے ترجمہ کرنے کا ذکر نہیں کیا گیا اور نہ ہی کہیں اس کے مترجم کا نام سامنے آیا ہے۔ پھر بھی اُردو کے نقادوں نے اس ناول کو کیوں نظر انداز کیا؟ شاید اس کی بڑی وجہ اُردو کے نقادوں کی اس ناول سے لاعلمی ہے۔

یہ ناول ۹ ابواب پر مشتمل ہے لیکن دیویندر اِسر نے اس کو ناول ماننے سے انکار کیا ہے اور اپنے ایک انٹرویو میں ناقدین کی آرا کو بھی پیش کیا ہے کہ اس ناول کے بارے میں دوسرے ناقدین کے کیا خیالات ہیں۔ گورچرن سنگھ نے دیونیدر اِسر سے ایک انٹرویو میں پوچھا:

س: آپ نے کہانیاں خوب لکھی ہیں۔ناول کی طرف دھیان کیوں نہیں کیا۔خوشبو بن کے لوٹیں گے کو کیا آپ ناول کے طور پر رکھنا پسند کریں گے؟

ج: ناول کے لیے جہاں بہت زیادہ وِوِڈ میموری (Vivid memory) اور آبزرویشن کی ضرورت ہوتی ہے، جبکہ مجھے نہ چہرے یادرہتے ہیں، نہ جگہیں، نہ نام، نہ حادثات۔ اب دیکھیے جب میں نے سوچا کہ پچاس برس کی زندگی کو قلمبند کروں تو بس ۸۰ صفحات میں ہی قصّہ ختم ہو گیا 'یعنی خوشبو بن کے لوٹیں گے'۔ کیا ناول ہے؟ دراصل میں نے اسے ناول کے طور پر لکھا ہی نہیں۔ مجھے ناول لکھنا آتا ہی نہیں۔ ویسے کہانیاں لکھنا بھی کہاں آتا ہے۔ بس مینٹل اسکوپ کو کسی نہ کسی طرح الفاظ کے جال میں بن لیتا ہوں۔ میرے لیے اتنے سارے کرداروں کے ساتھ اتنا لمبا سفر کرنا ممکن نہیں۔ لہٰذا ناول نہیں لکھ پایا۔

'خوشبو بن کے لوٹیں گے' کی صنف کو متعین کرنا بڑا مشکل ہے۔ اسے شعور کے تحت لکھی گئی کہانیوں کا سلسلہ کہا جائے یا آٹو رائٹنگ، یادداشتیں یا خود نوشت سوانح عمری۔ اسے فکشن یا جنرل کہیں تو بھی غلط نہیں ہوگا اور اس کی حقیقت صاف شفاف ہے یا یوں کہیے کہ یہ حقیقت نہیں، حقیقت کا واہمہ ہے۔ اس کا شفاف آئینہ ہے اس کی کہانی تو محض بہانا ہے۔(۲)

منموہن تلخ نے اپنے ایک مضمون ''دنیا میں اور تو'' میں اس ناول کو ایک داستان قرار دیا ہے۔(۳) شموئل احمد نے اپنے مضمون ''گہری ہوتی گپھاؤں کی کہانیاں'' میں اس کو سوانح عمری لکھا ہے۔(۴) حیدر قریشی نے اسے ترقی پسند اور جدیدیت کا امتزاج قرار دیا ہے۔(۵) راجی سیٹھ نے اپنے ایک مضمون ''دیویندر اِسر ایک جلاوطن کی عظمت'' میں اسے ایک بڑی عبارت، آپ بیتی، یادیں، ڈائری، کتھا، مضمون، طویل نظم کہا ہے۔(۶) ارچنا ورما نے اس ناول پر لکھے گئے اپنے مضمون ''جس نے خود کو تخلیق کیا'' میں اس ناول کے ۹ ابواب کو مختصراً انداز سے ایک پیراگراف میں یوں بیان کیا ہے۔

چھوٹی سی یہ کتاب ۹ ابواب میں منقسم ہے اور یوں تو سب ہی ابواب میں سب کچھ گھلا ملا ہے پھر بھی ہر باب کا اپنا ایک مرکزی موضوع ہے۔ مصنف کے 'میں' کا پہلا تعارف، مصنف کی حسیت کو ڈھالنے والے دائرے کے تجربے میں تبدیلی، یعنی خاص طور پر ملک کی تقسیم

،ہجرت ۔۔۔خود اپنے سے اپنا انٹرویو، ایک خط کے ذریعے اپنے ماضی کے شہر کا حال تخلیق
اور تنقید کے مسئلے اور کتاب کے ساتھ رشتہ، بدن اور بدن کے تعلقات، بے قابو پن، موت،
نفرت اور خوف سے نجات اور خلاصہ۔ ہر باب میں مصنف کے اپنے اپنے پسندیدہ لفظ میں
ایک انکائنٹر ہے۔ خلاصہ اور نتائج کے ساتھ۔(۷)

مرزا حامد بیگ نے ۱۹ دسمبر ۲۰۱۹ء کو راقم کے ساتھ ایک ٹیلفونک گفتگو میں (جب اس ناول کا ذکر ہوا) بتایا کہ اس پر انڈیا کے کسی پروڈیوسر نے فلم بنانے کا بھی منصوبہ بنایا تھا اور مجھے (مرزا حامد بیگ) اٹک کا منظر نامہ لکھنا اور ڈاکومنٹری فلم بنا کر بھیجنے کے لیے کہا۔ میں نے اٹک شہر پر ایک ۱۳ منٹ کی ڈاکومنٹری بنا کر بھیجی لیکن بعد میں اس ناول کو فلمانے کا ارادہ ختم ہو گیا۔ ہریش نول اپنے ایک مضمون 'نہ دِکھنے والا درد' میں اس ناول پر فلم بنانے کی کہانی کو اپنے الفاظ میں کچھ یوں بیان کیا:

میں نے اِسر جی سے کہا یہ ایسی تصنیف ہے جس پر بہت خوبصورت فلم بن سکتی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اُن کا بھی یہی خیال ہے۔ ایک عرصے کے بعد ایک صاحب نے اُس پر فلم بنانے کا ذمہ لیا بھی۔ ایک بے حد اثر انگیز اسکرین پلے بھی تیار کیا۔ اِسر جی تو خوشبو میں پھر پھر لوٹتے ہیں۔ انہوں نے نئے پروڈیوسر کو میرے کالج (ہندو کالج، جہاں میں پڑھاتا ہوں) کی ایک ادبی محفل میں انٹرویو کیا تھا، اُس کی عزت افزائی کی مگر وہ تو اِسر صاحب کا سامان لے کر چمپت ہو گیا۔ اِسر جی ریٹائر ہوئے تھے، فنڈ کا بڑا حصّہ اُس 'کلاکار' کے حوالے کر دیا جو اُس کے پارٹنر کی حیثیت سے کیا تھا۔(۸)

اب تک بیان کی گئی باتیں دیویندر اِسر اور اُس کے ناول کے بارے میں تعارفی نوعیت کی ہیں جس سے ناول کا قاری اس اہمیت کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ ناول کس قدر دیویندر اِسر کی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ دیویندر اِسر نے اس ناول کو لکھنے کے لیے اپنے پہلے سے لکھے گئے مضامین اور افسانوں سے بھرپور مدد لی ہے۔ یہ ناول ہندی زبان میں پہلی مرتبہ ودیارتھی پرکاشن، کے۔اے، کرشن نگر دہلی سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ دوسری اشاعت ۱۹۹۱ء میں اور تیسری اشاعت ۱۹۹۶ء میں ہوئی جبکہ اُردو زبان میں یہ ناول پہلی بار پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز جے ۶ کرشن نگر دہلی سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں مضمون، افسانے اور افسانوں کے اقتباس جو شامل کیے گئے ہیں اُن کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ آنندا، افسانہ (شیشوں کا مسیحا ۱۹۵۵ء) میں سے ایک پیراگراف لیا گیا ہے۔

۲۔ دل کی بستی (مضمون)(۹) یہ مضمون ۱۹۵۸ء گورنمنٹ کالج اٹک کے ادبی میگزین 'مشعل' کے لیے لکھا گیا تھا، بعد میں یہ مضمون مرزا حامد بیگ کی ادارت میں مشعل کا گولڈن جوبلی نمبر، انتخاب ۹۷۔۱۹۴۰ء

میں گوشہ کیمبل پور پھر کیمبل پور ہے (یادیں اور باتیں) میں شامل کیا گیا۔ یہ مضمون تھوڑی بہت ردو بدل کے ساتھ اس ناول میں شامل کیا ہے۔

۳۔ ''تین خاموش چیزیں اور ایک زرد پھول'' (افسانہ) یہ افسانہ افسانوی مجموعہ 'کینوس کا صحرا' ۱۹۸۳ء میں شامل ہے اس میں اسے ایک پیراگراف ناول میں شامل کیا گیا ہے۔

۴۔ ''سیاہ تل''، افسانہ (کینوس کا صحرا ۱۹۸۳) میں سے ایک پیراگراف شامل ہے۔

۵۔ ''مفرور''، افسانہ (کینوس کا صحرا ۱۹۸۳) یہ مکمل افسانہ ناول میں ایک باب کی حیثیت سے شامل ہے۔

۶۔ ''کالا جادو'' (افسانہ) اس میں سے ایک پیراگراف ناول میں شامل ہے۔

تنہائی انسان کو ہمیشہ یادوں کی طرف دھکیلتی ہے۔ جب یادوں کا سفر شروع ہوتا ہے تو پھر تنہائی میں انسان اپنے آپ سے خود کلامی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس ناول میں بھی دیویندر اِسر تنہائی میں یادوں سے مکالمہ کرتا ہے جس سے ان کی زندگی کے اتار چڑھاؤ واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔ شروع میں ماں سے جدائی، شہر سے جدائی، ایک انجان شہر کی طرف ہجرت اور اس کے بعد بیوی سے جدائی۔ یعنی دیوندر اِسر کی تنہائی اور یادوں کا جو سفر اٹک شہر سے شروع ہوا ان کی موت تک جاری رہا۔ تنہائی میں یادوں سے مکالمہ ان کے فکشن میں تواتر سے ملتا ہے۔ حیدر قریشی اپنے ایک مضمون ''دیویندر اِسر کی آخری ہجرت'' میں ان کی طویل زندگی کا احاطہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> حسن ابدال، کیمبل پور، راولپنڈی، کان پور، دہلی تک کے اسفار دیویندر اِسر کی پے در پے ہجرتوں کی داستان ہیں۔ دہلی میں آ کر وہ ٹک گئے تھے لیکن یہاں پھر انھیں داخلی ہجرت کے کرب سے گزرنا پڑ گیا۔ پاکستان میں بچپن میں ماں کی جدائی سہالی تھی، دہلی میں بیوی کے مستقل ہجر کا صدمہ ہوا۔ میاں بیوی میں علیحدگی ہوگئی، یہ مستقل ہجر ایک اور داخلی ہجرت تھی۔ اولاد بھی کسی کام نہ آئی گویا اندر ہی اندر ہجرت در ہجرت کرب کی لہریں اٹھتی رہتی تھیں (۱۰)

ناول میں نہ پلاٹ ہے نہ مرکزی کردار مختلف اصناف کی جھلک، مضامین اور افسانوں کے ٹکڑوں کا سہارا، اس سب کے پس منظر میں تنہائی اور یادوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ناول کو آگے بڑھاتا ہے۔ ناول کی ابتدا میں ہی ماں کے کینسر کے سبب ہونے والی موت کو جن الفاظ میں بیان کیا ہے ان کی گونج سے نجات پانا مشکل ہے۔ ماں کی موت سے ہونے والی تنہائی کو یوں بیان کرتے ہیں:

> جب میں پانچ برس کا تھا تو ایک دن نوکر آیا۔ میں سو رہا تھا۔
> ماں بلا رہی ہے۔ اس نے کہا

سونے دو بڑی نیند آ رہی ہے۔ میں نے کروٹ بدل لی۔
نہیں ماں جلد بلا رہی ہے۔
صبح مل لوں گا۔
اُس نے مجھے زبردستی گود میں اٹھالیا اور نیچے لے آیا۔ میں روتا جاتا اور اُس کے کاندھے پر وار کرتا جاتا تھا۔ ماں کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ نیچے فرش پر چار پائی سے لگے پتا ماں کا ہاتھ پکڑے بیٹھے تھے۔موسی، نانا، ماما، بھائی اور کئی دوسرے لوگ کمرے میں موجود تھے۔ ماں نے مجھے قریب بلایا میں اس کی چھاتی پر سر رکھ کر سو گیا۔شاید اس نے میری پیٹھ تھپتھپائی تھی۔ دعائیں دی تھیں کچھ یاد نہیں۔سب خواب تھا۔ جو ٹوٹا تو سب رو رہے تھے۔ ماں نہیں رہی تھی۔(۱۱)

اس باب میں جہاں ماں سے جدائی کا تذکرہ ہے وہاں آگے اس میں اُس وقت درد وسوز پیدا ہوتا ہے جب انھیں اپنی دھرتی سے بھی جدائی کا غم سہنا پڑا۔اس درد کو دیویندر اِسر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

تم جہاں پیدا ہوئے ہو، اس دھرتی سے، اس نگر سے، اس گاؤں سے، اس جنگل سے ہجرت کر سکتے ہو۔لیکن اپنے اندر سے اس دھرتی کو، اس نگر کو، اس گاؤں کو، اس جنگل کو باہر نہیں نکال سکتے۔لیکن میری تہذیب، میرا سماج، میری حکومت، میرا مذہب، میری تعلیم، میری معیشت، روزگار، رشتہ دار، بیوی بچے مجھے ایک گھر میں بند کر کے میرے اندر کے اس بھوت کو نکالنے کے لیے مجھے ہر روز اذیت دیتے رہتے ہیں۔لیکن یہ بھوت یا پرچھائیں میرے اندر سے نہیں نکلتی۔ وہ لوہے کی گرم گرم سلاخوں سے میرے سارے جسم کو داغ دیتے ہیں۔بھوت چھٹپٹا کر رہ جاتا لیکن نکلتا نہیں۔ میں اسے مار نہیں سکتا وہ اُسے نکال نہیں سکتے۔ یہ میری قسمت ہے یا ٹریجڈی، کہہ نہیں سکتا۔(۱۲)

ناول میں ۱۹۳۹ء کی جنگ عظیم، تحریک آزادی ہند، بنگال کا قحط، اسٹالن کا حشر، ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے اعلان کا احاطہ بڑی طوالت سے کیا گیا ہے اور اس دور میں ہونے والے تمام سانحات کا ذکر قاری کو بھی یادوں کی دنیا میں لے جاتا ہے۔یہ باب مکمل طور پر حوالہ جاتی اقتباسات کی مدد سے تشکیل دیا گیا ہے۔

ناول کا ایک باب افسانوی مجموعہ ''کینوس کا صحرا'' میں شامل افسانہ ''مفرور'' پر مشتمل ہے۔ناول میں شامل اس افسانے میں فلیش بیک کی تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے۔اس افسانے کا کردار اپنے ماضی کو فراموش کرنا چاہتا ہے، بھولنا چاہتا ہے لیکن بھلا نہیں پاتا ہے۔اس کی یادیں ان کو مفرور نہیں ہونے دیتی ہیں۔وہ فرار ہونے کی کوشش کرتا ہے لیکن یادیں واپس کھینچ لاتی ہیں۔ ہر بار ایسی تلخ حقیقت سامنے آتی ہے جو

اُس کے بدن میں ایک ناسور کی شکل میں ہرلمحہ موجود رہتی ہے۔ان یادوں سے وہ چھٹکارا حاصل نہیں کر پاتا۔

یہ ناول اس لحاظ سے بھی بہت اہمیت کا حامل اور منفرد ہے کہ ہر باب میں ایک الگ تکنیک کا تجربہ کیا گیا ہے۔ناول کے ایک باب میں دیویندر اِسر نے پرانی یادوں کو خطوط کے سہارے بیان کیا ہے۔جس کا لطف ''سوفی کی دنیا'' میں لکھے جانے والے خطوط سے زیادہ ہے۔اس باب میں انھوں نے اُن خطوط کو شامل کیا ہے جو دیویندر اِسر نے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۲ء تک کے عرصے میں اپنے دوستوں کو لکھے تھے۔ان خطوط میں بھی ان کی یادوں کی دنیا آباد ہے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۲ء تک ایک چوتھائی صدی خط۔دوستوں سگے سمبندھیوں،ادیبوں،نقادوں اور پیاروں کے خط۔ گلے شکوے، قسمیں ،وعدے، پیار و وفا، تیر نشتر، چوٹیں،چمن پھول کانٹے، آنسو مسکراہٹیں،درد و دوا، کیا کیا نہیں تھا۔ان خطوں میں نزدیک اور دور سے آئے ہوئے خط، کھلی ڈاک سے آئے اور چھپے چوری دیئے خط، رنگ برنگ لفافوں میں الفاظ۔ نیلے، لال، کالے اور ہرے رنگوں میں ڈھلے الفاظ، تلخ ترش اور شیریں۔

خط کا لفافہ نہیں کھلتا،انسان کا دل کھلتا ہے۔لفظ زبان بن جاتا ہے اور دل دل سے مخاطب ہوتا ہے۔ہر لفظ اپنے لکھنے والے کا چہرہ اور دل کی دھڑکن لیے روح کا آئینہ بن کر کھلتا ہے۔کبھی الفاظ اتنے ٹھنڈے کہ چھونے سے انگلیاں سُن ہو جائیں۔کبھی اتنے گرم کہ جسم جھلس کر رہ جائے،الفاظ جو دل کی دھڑکن سانس کی رفتار اور خون کی گردش گرم کر دیں۔زہر میں بجھے ہوئے الفاظ سُرخ تپش میں سلگتے الفاظ، مہکتے، دہکتے، چہکتے الفاظ،سڈول یا غیر مرئی الفاظ جن کو چھوؤ تو چھوئی موئی ہو جائیں۔سہلائیں تو انگڑائی لے کر بے دار ہو جائیں۔(۱۳)

ناول میں مرزا حامد بیگ کا ایک مکمل خط بھی متن کا حصّہ ہے جس میں مرزا حامد بیگ اُن کو کیمبل پور (اٹک) کے کالج کی صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہیں۔اس خط میں ڈاکٹر اجمل،صدیق کلیم اور غلام جیلانی برق کے ادوار اور ان کی علم و ادب پر دسترس کا تذکرہ بھی شامل بحث کیا گیا ہے۔اس کے بعد اٹک کالج سے فارغ التحصیل عظیم ہستیوں کا بھی ذکر کیا ہے جن میں احمد ندیم قاسمی،منظور عارف،منیر احمد المعروف منو بھائی، شفقت تنویر مرزا، فتح محمد ملک اور وقار بن الٰہی کا ذکر بھی خوب ہے۔دیونیدر اِسر کے اساتذہ کا ذکر مرزا حامد بیگ اپنے ایک خط میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> ڈاکٹر اجمل صاحب کچھ عرصے پہلے اسلام آباد میں تھے۔آج کل فرانس میں ہیں۔وہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے وائس چانسلر اور مرکز کے سیکرٹری ایجوکیشن بھی رہے ہیں۔صدیق کلیم صاحب گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل رہے پھر ٹیکسٹ بک کمیٹی سے متعلق رہے۔آج کل لاہور میں ہیں۔ڈاکٹر غلام جیلانی صاحب سے ابھی چندروز پہلے سرِ راہ ملاقات ہوگئی تھی۔اب وہ بہت بوڑھے ہو گئے ہیں۔(۱۴)

ناول میں خط کے تذکرے کے بعد دیوبندر اِسر کا مضمون ''دل کی بستی'' شروع ہوتا ہے جو ۱۹۵۸ء میں اٹک کالج کے میگزین ''مشعل'' میں شائع ہوا تھا۔اس باب میں ایک معمولی مسئلہ درپیش ہے۔جذبات واحساسات کے لیے جوالفاظ دیوبندر اِسر نے اپنے مضمون 'دل کی بستی'' میں فتح محمد ملک کے خط کی یاد میں لکھے ہیں اُنھی الفاظ کا چناؤ ناول میں مرزا حامد بیگ کے خط کے لیے بھی کیا ہے:

ننھا سا پیارا خط۔جس کے الفاظ ہزار بار لکھے اور سنے گئے ہیں۔جس کے جذبات نئے اور اچھوتے نہیں لیکن جس کے پڑھنے سے ایک ایسی کیفیت کا احساس ہوتا ہے جو اس بے نام جذبے کو اُس شعور میں بدل دیتا ہے کہ تم ایک بادل کی طرح ہو جو سمندر سے اٹھ کر ہوا کی لہروں پر اُڑ کر فضاؤں میں بھٹک گیا ہے اور رہ جاتی ہے دل کی بستی جو مدت سے سونی پڑی ہے۔(۱۵)

ناول میں دیونیدر اِسر نے اپنے ذہنی تناؤ اور کشمکش کو بھی بھر پور انداز میں بیان کیا ہے۔جس تنہائی میں وہ مبتلا ہیں وہ ان کے ہجرت کے بعد کی تنہائی ہے۔ایک انجان شہر میں جن تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ایک انسان کی جو کیفیت ہوتی ہے،اُن کا تذکرہ کیا گیا ہے۔سب سے پہلا مسئلہ ہی اُن کا ہجرت کے بعد ابلاغ کا ہے جس میں وہ زبان کے استعمال کے حوالے سے بھی کنفیوژ ہیں۔

تمھیں زبان نہیں آتی

میں خاموش رہا

تم غلط زبان لکھتے ہو

پھر خاموشی

کبھی ہندی کے الفاظ لکھتے ہو،ہندی میں ناکام رہتے ہو اُردو الفاظ کا استعمال کرنے لگتے ہو۔اور یہاں بھی مات کھاتے ہو تو انگریزی کی پناہ لیتے ہو اور پھر ٹھیٹھ پنجابی پر اتر آتے ہو۔

آپ صحیح فرماتے ہیں میں نے کہا۔

تم الفاظ کا صحیح استعمال بھی نہیں کرتے۔

میں کسی چیز کا بھی صحیح استعمال نہیں کرتا،میں استعمال ہی نہیں کرتا۔

۔۔۔ہر تخلیق اس عمل سے گزرتی ہے۔پہلے اُردو لکھنا شروع کیا اور بعد میں ہندی میں،پنجابی میری مادری زبان ہے اور روزی انگریزی سے کماتا ہوں۔اور سب گڑبڑ ہو گیا۔(۱۶)

یہ ذہنی تناؤ اور کشمکش دیونیدر اِسر کو خودکشی کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔وہ ان تخلیق کاروں کو یاد کرتے ہیں جنھوں نے خودکشی سے اپنی زندگی کا خاتمہ کیا۔اپنے اُن افسانوں کا ذکر کرتے ہیں جن

میں اکثر کردار موت یا خودکشی کے ذریعے زندگی سے راہ فرار اختیار کرتے ہیں۔مثلاً آنندہ، کالا جادو، تین خاموش چیزیں اورایک زرد پھول، کالاتل وغیرہ۔اس کے علاوہ بھی دیوندر اِسر کی کہانیوں میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا کرداراور خاص طور پر خودکشی کرنے والے کرداروں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے۔اور پھر آخر میں دیوبندر اِسر اپنے اٹک کالج کے اساتذہ اوراپنے اساتذہ کے پیار کرنے والے رویے کوبھی یاد کرتے ہیں۔

ناول میں دیوبندر اِسر نے اپنے منتشر خیالات کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہےاوراس دور کو یاد کیا ہے جب ۱۹۵۰ء میں دلی آیا تھااور وہ اس شہر میں اجنبی تھا جب اسے کسی کے سہارے کی ضرورت تھی۔ناول میں موت، زندگی، محنت اور نفرت کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔موت کی تصویر کوانھوں نے ۱۹۴۷ء کے فسادات کے پس منظر میں بیان کیا ہے۔اس باب میں دیوبندر اِسر موت، تنہائی، محبت زندگی اور نفرت سے مکالمہ کرتے ہیں اور پھر وہ تنہائی کے بارے میں اپنا نظریہ ذرا مختلف انداز میں یوں پیش کرتے ہیں۔

> سوال تنہائی کا ہے۔تنہائی دوسرے لوگوں سے الگ ہونے میں نہیں ۔یہ ایک ذہنی کیفیت ہے۔داخلی تنہائی ایک حقیقت ہے اور ہم وہ سب عمل کرتے ہیں جس سے ہم اس تنہائی سے بچ سکیں۔آدمی اپنے گہرے احساس اور بلند ترین تخیل میں اکیلا ہوتا ہے۔(۱۷)

ناول کے اختتام پر دیوبندر اِسر ایک مرتبہ پھر اپنی تنہائی اور یادوں کی دنیا میں بسیرا کرتا ہے۔ایسے میں نارکندے کی رات کو کسی طرح بھی فراموش نہیں کر پاتے ہیں۔اس کے بعد اپنی ماں کی موت کے منظر کو یاد کرتا ہے۔اسی حوالے سے خواب بھی اس کی یادوں کا حصّہ ہے۔زندگی کے طویل سفر کو شاعرانہ انداز میں یاد کرتا ہےاور زندگی سے ان الفاظ میں شکوہ کرتے ہیں:

> زندگی ہم نے تم سے بہت پیار کیا ہے۔بہت چاہا ہے۔تم ہم سے بہت روٹھی بھی، بے رخی بھی برتی، لیکن ہماری چاہت کم نہیں ہوئی۔ہم نے تم سے بے وفائی نہیں کی، تھوڑی سی بھی نہیں، آج اس ڈھلتے ہوئے سورج کے سامنے بیٹھے، جب ہم تم سے دھیرے دھیرے دور ہو رہے ہیں تو نہ جانے اپنے دوست کا یہ شعر بار بار کیوں یاد آ رہا ہے۔
>
> بھیگی ہوئی شام کی دہلیز پر بیٹھے
> ہم دل کے سُلگنے کا سبب سوچ رہے ہیں(۱۸)

دیوبندر اِسر کی تنہائی کا یہ طویل سفران کی گمنامی کی موت پر اُس وقت ختم ہوا جب وفات کے کافی عرصے بعد ادبی دنیا میں یہ اعلان ہوا کہ اب دیوبندر اِسر اس دنیا میں نہیں رہے۔یہاں تک کہ بھائی بہن، عزیز واقارب اور دوستوں کوان کی موت کا پتا نہ چل سکا کیونکہ بیٹوں نے موت کی خبر کو پوشیدہ رکھا۔یہ ان کی تنہائی کا وہ سفر ہے جس میں کوئی بھی شرکت نہ کر سکا۔دیوبندر اِسر نے اپنی زندگی کے تلخ حقائق اور مشاہدات کو

بڑی باریک بینی اور ایک منفرد تکنیکی انداز سے ناول میں پیش کیا ہے۔شمیم حنفی کا کہنا درست ہے کہ اِسر صاحب کا مکالمہ اپنے ماضی سے بھی ہے اور مستقبل سے بھی ہے۔(۱۹) لیکن دیویندر اِسر کا ماضی سے مکالمہ فکشن کا حصّہ ہے جبکہ مستقبل سے مکالمہ اُن کے تنقیدی نظریات کی عکاسی کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) فاری شا، ' اسرارِ خودی'، مشمولہ، ماہنامہ چہارسو، جلد:۱۵، شمارہ مئی، جون، راولپنڈی، ۲۰۰۶ء، ص۔۵

(۲) گورچرن سنگھ، 'پتھروں کے شہر میں ایک شیشہ گر'، مشمولہ، ایک دانشور ایک مفکر: دیویندر اِسر، مرتبہ، نندکشور وکرم، دہلی: پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، ۲۰۳۱ء، ص۔۱۲۶

(۳) منموہن تلخ، 'دنیا میں اور تو'، ایضاً، ص۔۱۹۸

(۴) شموئل احمد، ' گہری ہوتی گپھائوں کی کہانیاں'، ایضاً، ص۔۲۱۵

(۵) حیدر قریشی، 'دیویندراسر کی آخری ہجرت'، مشمولہ، عالمی اُردو ادب، جلد ۳۶، دسمبر ۲۰۱۳ء، ص۔۲۳

(۶) راجی سیٹھ، 'دیویندراِسر ایک جلا وطن کی عظمت'، مشولہ، ایک دانشور ایک مفکر: دیویندر اِسر، ایضاً، ص۔۱۵۷

(۷) ارچنا ورما، ' جس نے خود کو تخلیق کیا'، ایضاً، ص۔۱۸۷

(۸) ہریش نول، ' نہ دکھنے والا درد'، ایضاً، ص۔۹۵

(۹) دیویندر اِسر، 'دل کی بستی'، مشمولہ، مشعل، گولڈن جوبلی نمبر، انتخاب: ۹۷۔۱۹۴۰ (مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، گورنمنٹ کالج اٹک، ۱۹۹۷ء، ص۔۲۰۸، ۲۰۹

(۱۰) حیدر قریشی، 'دیویندراسر کی آخری ہجرت'، ایضاً، ص۔۱۹۱

(۱۱) دیویندر اِسر، ' خوشبو بن کر لوٹیں گے'، دہلی: پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، ۱۹۸۸ء، ص۔۱۲

(۱۲) ایضاً، ص۔۱۴، ۱۵ (۱۳) ایضاً، ص۔۴۶

(۱۴) ایضاً، ص۔۴۹ (۱۵) ایضاً، ص۔۵۰

(۱۶) ایضاً، ص۔۵۳ (۱۷) ایضاً، ص۔۷۹

(۱۸) ایضاً، ص۔۸۷

(۱۹) شمیم حنفی، ہم نفسوں کی بزم میں، دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جون ۲۰۰۶ء ص۔۱۹۸